

مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی

کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب صاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۃ حجرات تکمیل ہے۔ یہ عظیم سورت اجتماعیات انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات بلند تر سطح پر یہ صرف قومی و ملی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملت اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور ایقان و یکجہاد کی بجائے برقرار رکھی جاسکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستور اساسی کیا ہے، اس کی شہریت کسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورت کو بغرض تفہیم میں حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے۔

پہلا حصہ مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے اصل الاصول، یعنی اسلامی ریاست کے دستور اساسی اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی صلی کے اصل قوام یعنی ”مركزیت“ سے بحث کرتا ہے۔

پہلا پہلا پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست و مادر پدر آزاد، نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے پابند ہیں، اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے لئے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گو ماکہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی مسلمان، قرار دی جاسکتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشبیہ کے مطابق اسی

لے کتابت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے بیشاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ برید

طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بندی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے
- کھوٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے علاوہ
یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستور اساسی میں حاکمیت سے متعلق اولین دفعہ کو متعین کر
دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی، نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف
خدا کی ہے (إِن الْحُكْمُ لِلَّهِ) اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION)

صرف یہ ہے کہ رسول کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا کی مرضی و منشا کو پورا کرے۔ لہ
آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل روح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔
یعنی تقوی اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی اصل ثانی، کو واضح کیا گیا جس
کے گرد مسلمانوں کی حیاتیاتی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کا ادب، آپ کی تعظیم و توقیر، آپ کی محبت اور عشق اور آپ کے مقام و مرتبہ
سے اکابر و اعلیٰ کرام (وَمَا يَكْفُرُ دُشُونُ اللَّهِ) اور ہر اس قول و فعل یا قیام
اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں مجہول گستاخی یا تحقیر و توہین
کا پہلو نکلتا ہو رکھ، ادب کا ہیئت زیر آسمان از عرض نازک تر!

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدہ توحید
فی الالوہیت کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطور جلی اس
کا ذکر موجود ہے لہذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا۔ اس کے
بالمقابل اصل ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے
کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ

بمصلحة ابرساں خویش را کہ دیں ہمہ دوست!

اگر بہ اود نہ رسیدی تمام بولہبی است!

اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں ملت اسلامیہ
کے پاس وہ مرکزی شخصیت، موجود ہے جس سے تمدن انسانی کی وہ فطری ضرورت تمام
و کمال اور بغیر تشغ و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لئے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و
اجتہاد کے ساتھ شخصیتوں کے بت تراشنے اور بہرو، (HEROES) گھڑنے کا حکمیر

مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو طرہ و می تماشد فکر ماہر دم خداوند

وگرہ: کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بت تراشیں، لیکن اس کے پاس ایک دائم و قائم مرکز، موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY) کا ضامن ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ”اَنْتَ فِیْکُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ قیامت پوری امت مسلمہ سے ہے، اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ، امت مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزیت، ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرق اقصیٰ سے لے کر مغرب بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل و لسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے اتہائی بعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENIETY) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی

بیشک نظر رہنا چاہیے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور علاقائی شخصیتوں، کو بس ایک حد تک ہی ابھارنا چاہیے، اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے وحدت ملت، کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال۔

یہ زائیں حرم مغرب ہزار ہر نہیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھے ناساز ہیں
رہتے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیار قیادت ایک ہی رکھنا چاہیے اور وہ ہے فاتحہ فداء الہی و اتھی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلمانوں کی ہیت اجتماعی کی تذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ زعفرانی و منطقی ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی، پہلی پر دستور و قانون کا دابر و مدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اس دائرے میں آنحضور ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلاویز اور دلنواز شخصیت کو حامل ہے جن کے اتباع کے جذبے سے اس ہیت اجتماعی کو ثقافتی یک رنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم اگر بھی جڑے رہتے ہیں

اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ مقام رسالت، کے ذکر میں طول کلام فی الواقع عذر و لذیذ بود حکایت و راز تر گفتیم!، کے مصداق ہے، دوسرا حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملت اسلامیہ کے افراد اور گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتہ محبت و الفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف و انتشار اور فتنہ و فساد کو بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ اہم تراکام جو وسیع تر پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بچت کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتہً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سد باب کرتے ہیں۔

مقدمہ الذکر احکام دو ہیں: ۱۔ انواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا اہتمام ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرز عمل۔ یعنی: یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے گویا کہ لا تعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں، ب: اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر مصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریق ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئت اجتماعیہ کو کرنا چاہیئے اور ج: جب وہ گردن جھکا دے تو از سر نو عدل و قسط پر مبنی صلح کرا دی جائے۔ (اس نظام پر عدل اور قسط کا مکرر مکرر ذکر خاص طور پر اس لئے ہے کہ جب پوری ہیئت اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں ان چھ معاشرتی برائیوں سے منع

۱۔ اس سلسلے میں انصاف و عدل کے یہ الفاظ مبارک مستعمل رہنے چاہئیں کہ "کفی بالمرکذ با ان یحدث بکل ما سمع" ایک شخص کے معمولے ہونے کے لئے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے آگے بیان کر دے (یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق و تصدیق نہ کرے!)

فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتہ محبت و الفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت و عداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کمزورت پیدا ہو جاتی ہیں جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس لئے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھماؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔ ۱۔ تمسخر اس کے سد باب کے لئے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر و قیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے، ۲۔ عیب جوئی اور کبر تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے، ۳۔ تمسخر اور عیب جوئی دونوں ایک دوسرے کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد بُرائی کا نام بھی نہایت بُرا ہے، ۴۔ سوزن (اس لئے کہ بہت سے ظن گناہ کے دیسے میں ہیں) ۵۔ تجسس اور ۶۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شہادت کے اظہار کے لئے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ (اس لئے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزت کے تحفظ پر قادر نہیں ہوتا۔

الغرض ان اٹھاوا مروئوا ہی سے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے۔ اس لئے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فسیل بھی بہر حال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دار و مدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چولے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح مکت اسلامیہ کے استحکام کے لئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا میرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے اسی قدر اُن کے مابین رشتہ محبت و الفت کی استواری بھی لازمی ہے۔ یہ البتہ واضح رہے کہ مکت اسلامیہ کا استحکام عام قومی تصورات کے تحت و نبوی غلبہ و اقتدار کے لئے نہیں بلکہ اس لئے

مطلوبہ کہ وہ عہدہ ہم کو جیسے ہیں کہ دنیا میں ترانہ رہے! کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) ہے!

تیسرا حصہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے!

۱۔ پہلی بحث انسان کی عزت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزت و ذلت یا شرافت و ذالت کا معیار نہ گنبد ہے نہ قبیلہ نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف و تقویٰ ہے اس لئے کہ پوری نوع انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے آدم و حوا، کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہ بھی نہایت اہم ہے اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بد امنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور کھڑا کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غریبی ہے اور یہ قومی گروہی مغافرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافات کا اصل سبب بنتی ہے اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن ملے دشمن بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعہ انسانی عزت و شرف کی تذکرہ بالامت غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا، لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دورِ مخ لائق توجہ ہیں۔ ایک مسئلہ، یہ کہ اوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی ان کی جڑیں جو گمراہی کا فرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تباہی کا جذبہ ہے اور یہ دو سرے یہ کہ

۲۔ چنانچہ ایچ جی ویلز (H. G. WELLS) اپنی ”مختصر تاریخ عالم“ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات و اخوت کے نہایت اونچے و عظیم تو اگرچہ مسیح نامری (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ذوالابی واتی، کا نام ہے۔

اسلام ان میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خاص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہل ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیار عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار !

اس سلسلے میں معنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں کے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو پوری فوج انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدت الہ اور ۲۔ وحدت آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اہل اسلام نے لے کر اس مقام پر مخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ سے ہوا واضح رہے کہ قرآن حکیم میں سورہ حجرات کی اس آیت مبارکہ کا مثنیٰ سورہ نساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں (۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے !

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اس کا خارجی ظہور ہے، لہذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کر لے اسے ”أَيُّهَا تَدْعُوَكُمْ إِلَى الْحُسْنَى“ ایک انگریزی مقولے کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے۔ بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نعمتِ کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت

واضح ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے، اس لئے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و گفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف ”اِقْرَأْ بِاللِّسَانِ“ والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہو گئی
ایکٹ: یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کی دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق۔ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ یہ چیز بھی منبہی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حسنیٰ غفور اور رحیم سے کر دیا گیا کہ اس اطاعت کو بھی سند قبول عطا فرمادی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخری دور میں جب ”وَدَّأَيَّتِ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَخْوَاجًا“ کی متصور ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں امت مسلمہ کے سوا اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اولین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے یعنی یہ کہ انسان ہدایت آسمانی کی نشروائشا اور حق کی شہادت، اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لئے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جد و جہد میں تن من و جان سب کو قربان کر دے۔ آیت کے آخر میں مزید مہول کر دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔